ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE: 2789-8784

ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com

ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.3 (2024)
(July to September)

سیّد احتشام حسین اور اُردو ناول کی تنقید

Syed Ehtesham Hussain and criticism of the Urdu Novel

نوید اختر

پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبۂ اُردو، سرحد یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

ڈاکٹر محمد امتیاز

پروفیسر، شعبۂ اُردو، سرحد یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

Naveed Akhtar
Ph.D. Scholar, Department of Urdu, Sarhad University of Science and information Technology, Peshawar
Dr. Muhammad Imtiaz
Professor, Department of Urdu, Sarhad University of Science and information Technology, Peshawar

Abstract:
In Urdu literature, there are few such reliable and distinguished critics whose critical work is seen with great esteem. Syed Ehtesham Hussain is also an important name in these literary critics. Even the great critics of Urdu literature are convinced of his eloquent nature, deep studies and profound understanding. Theoretically, he is related to Marxist critical school, but he is called the founder of Marxist critical school in Urdu. By applying the critical principles of the same school, he filled the field of Urdu criticism with his extensive study and careful approach. With his rationality, not only the Marxist criticism of Urdu was repeated, but he developed the theoretical and practical criticism of Urdu on modern lines. With his reasoning, not only did the Marxist criticism of Urdu flourish, but also built the theoretical and practical criticism of Urdu on new lines. It should be attributed to the lack of luck in the criticism of Urdu fiction that prominent and coin-opposed critics like Ehtesham Hussain have written very little on the criticism of Urdu fiction, but His short work is also seen with great esteem in Urdu criticism.

Keywords: Theoretical Criticism, Practical Criticism, Marxist Criticism, Ideological affiliation, great esteem, Urdu fiction

اُردو ادب میں چند ایسے معتبر اور ممتاز ناقدین موجود ہیں جن کے تنقیدی کام کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اِن ناقدین ادب میں ایک اہم نام سید احتشام حسین کا بھی ہے۔ ان کی طبع رسا، عمیق مطالعے اور ژرف بینی اردو ادب کے بڑے بڑے ناقدین بھی قائل ہیں۔ نظریاتی طور پر ان کا تعلق مارکسی تنقیدی دبستان سے ہے، بلکہ ان کو اردو میں مارکسی تنقید کا بانی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اسی دبستان کے تنقیدی اصولوں کو کام میں لاتے ہوئے اپنے وسعت مطالعہ اور مدبرانہ انداز سے اردو تنقید کے دامن کو گہر آب دار سے بھر دیا ہے۔ ان کی اسی استدلالیت سے نہ صرف مارکسی اردو تنقید بارآور ہوئی بلکہ اردو کی نظری اور عملی تنقید بھی جدید خطوط پر

استوار ہوئی۔ اسے اردو فکشن کی تنقید کی کم نصیبی پر محمول کیا جائے کہ احتشام حسین جیسے ممتاز اور سکہ بند نقاد نے اردو فکشن کی تنقید پر بہت کم لکھا ہے مگر ''بقامت کہتر بہ قیمت برتر'' کے مصداق ان کا کم کام بھی اردو تنقید میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اردو تنقید کی تاریخ اور ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے ترقی پسند ناقدین میں سرِ فہرست سید احتشام حسین کا نام آتا ہے۔ ان کا شمار جدید دور کے اہم ترین ناقدینِ ادب میں ہوتا ہے۔ ان کی تنقید کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک نظری تنقید اور دوسری عملی تنقید۔ اردو فکشن کے حوالے سے وہ پہلے نقاد ہے جنھوں نے اردو میں نظری تنقید کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کو بھی پروان چڑھایا۔ اس ضمن میں انھیں اردو میں عملی تنقید کا بنیاد گزار کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کیوں کہ نہ صرف انھوں نے پہلی مرتبہ اردو تنقید میں عملی تنقید کے اچھے خاصے نمونے پیش کیے بلکہ عملی تنقید کے طریقہ کار اور اصول بھی وضع کیے۔ احتشام حسین نے جب اردو ناول کے فکر و فن پر تنقید لکھنا شروع کیا اس وقت ہماری تنقید زیادہ تر نظری اور تاثراتی تنقید کے حدود کے اندر ہو رہی تھی۔

سید احتشام حسین ایک خاص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود ان میں نظریاتی تعصب بالکل نہیں تھا۔ مارکسی نظریات اور اصولوں کی طرف کماحقہ جھکاؤ رکھنے کے باوجود انھوں نے کبھی دوسرے نظریات اور اصولوں کو رد نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی طبع رسا سے ان نظریات کو بغیر معاندانہ اور متعصبانہ رویہ کیے باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ رد و قبول بھی منطقی دلائل سے کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اگر دوسرے نظریات سے اختلاف بھی کیا ہے تو صرف مخالفت برائے مخالفت سے نہیں بلکہ مضبوط عملی و عقلی دلائل سے اپنی بات واضح کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کے وسعت پر دلالت کرتے ہیں۔ ادب کے ساتھ ساتھ تاریخ، سیاسیات، اقتصادیات، عمرانیات اور سماجیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس بارے میں پروفیسر نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر احتشام حسین کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ادب کے علاوہ جملہ سماجی علوم خاص طور پر تاریخ، سیاست، اقتصادیات اور عمرانیات وغیرہ پر ان کی گہری نظر ہے۔ مزاج میں سنجیدگی ہے، غور و فکر ان کی عادت ہے۔ ان سب سے مدد لیے بغیر وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچتے لیکن جب کسی فیصلے پر پہنچ جاتے ہیں تو نہایت مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہتے ہیں۔''(۱)

سید احتشام حسین نے تنقید میں سماجی علوم کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے اس عمیق مطالعے کی خوبی کے بارے میں ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> ''احتشام حسین اردو کے ممتاز نقاد اور دانش ور کی حیثیت سے اپنی مخصوص پہچان رکھتے ہیں۔ دانش ور کی حیثیت سے اس لیے کہ انھوں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں علمی بلکہ بین العلومی پس منظر کو اپنی تفہیم کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جہاں تک ان کی ناقدانہ حیثیت کا سوال ہے تو انھوں نے سماجی علوم اور دوسرے متعلقاتِ ادب کی بحثیں چھیڑ کر عملی طور پر ادب و شعر کے خود مکتفی تصور کی نفی کی۔'(۲)

تنقید کے اصول و نظریات اور عملی تنقید پر انھوں نے کوئی مبسوط اور مستقل تنقیدی تصنیف نہیں چھوڑی بلکہ ان کے وہ تنقیدی مضامین جن کی تعداد تقریباً ۲۵۰ تک پہنچتی ہے اور جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے یا کسی ادبی جلسے میں پڑھے گئے تھے۔ پھر ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ یہ مضامین جامع اور مدلل بھی ہیں جس میں کسی قسم کی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ انھوں نے فکشن کی تنقید پر دو مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک ''ناول اور افسانے سے پہلے''، مشمولہ روایت اور بغاوت،

دوسرا مضمون ''اردو ناول اور سماجی شعور'' مشمولہ ذوقِ ادب اور شعور کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ دونوں مضامین اپنی جامعیت کے لحاظ سے بہت فکر انگیز اور معنی خیز حیثیت کے حامل ہیں۔ اردو فکشن کے حوالے سے یہ ایسے مضامین ہیں جس میں فکر و نظر کے ایسے گوشے منور اور بعض ایسی بحثیں کھل کر سامنے آگئی ہیں جو اس سے پہلے اردو فکشن کی تنقید میں موجود نہیں تھیں۔ انھوں نے عملی اور نظریاتی ہر دو طرح کے مضامین لکھے ہیں۔ ہمارے ہاں فکشن کے متعلق زیادہ تر تاثراتی تنقید کے نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے پہلی مرتبہ فکشن کے حوالے سے نظری تنقید کے ساتھ عملی تنقید کو بھی فروغ دیا۔ ان کے مضامین میں عملی تنقید کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ اس طرزِ تنقید میں بھی ان کا عمیق مطالعہ اور استدالی انداز بیاں ان کو انفرادیت بخشتا ہے۔

ان کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ''روایت سے بغاوت'' جو ۱۹۴۸ء کو منصہ شہود پر آیا۔ اس کتاب میں ان کا تنقیدی مضمون ''ناول اور افسانے سے پہلے'' میں انھوں نے کہانی کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس سے ان کی تنقیدی بصیرت کے موقف کی بھی تائید ہوتی ہے۔ مضمون کے آغاز میں انھوں نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کہانیوں کا آغاز انسان کی سماجی زندگی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوا۔ ابتدائے آفرینش سے کہانی انسان کی سرشت میں پڑی ہوئی ہے۔ یہی وجہ سے کہ انھوں نے کہانی کو پیدائش اور ارتقا کو انسانی سماج کے ساتھ جوڑا ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''انسان ابتدا ہی سے سماجی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ سماج کو بدلتا اور سماج کے ساتھ خود کو بدلتا رہا ہے۔ سماج کو بناتا اور سماج کے ساتھ خود بنتا رہتا ہے۔ زمان و مکان کی وسعت میں یہی تغیر ہے جس نے علم الاساطیر، دیومالا، مذہبی کہانیاں، داستان افسانے اور ناول پیدا کیے۔ کہانیوں کی یہ شکلیں انسانی معاشرت کی تبدیلیوں میں اپنی جڑیں رکھتی ہیں۔''(۳)

کہانی کے متشکل ہونے پر بہت سی چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک کہانی ایک ہی وقت میں مختلف علاقوں اور ملکوں میں مختلف انداز میں بیان ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ کہانیوں پر ایسی کئی چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں جو اس میں تغیر و تبدل کا باعث بنتی ہے۔ یہ تغیر و تبدل معاشرتی، معاشی اور جغرافیائی ہر لحاظ سے ہوتی ہے۔ اسی مقامی اثر پذیری کے تحت وہ اس علاقے یا خطے کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہیں۔ کہانی کی موجودہ شکل جو ناول اور افسانے کی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ اصل میں انسانی سماجی زندگی کے تغیرات کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ سید احتشام حسین اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''کہانی کی شکلوں میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں ان کے اصل اسباب کو معاشی اور معاشرتی حالات میں تلاش کرنا چاہیے۔ آج جو کہانیاں ناول اور افسانوں کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ انھیں سامنے رکھ کر اگر ان کی ابتدائی تصویر بنانے کی کوشش کی جائے تو غیر معمولی تحقیق و تدقیق سے کام لینا ہوگا۔ انسان کی سماجی زندگی اور اس کے تغیر پذیر ماحول کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔''(۴)

سید احتشام حسین نے درج بالا اقتباس میں کہانی اور انسان کے سماجی ماحول کے ربط کو بڑی استدلالیت سے بیان کیا ہے۔ تاریخ کو وسیع مطالعہ رکھنے کی وجہ سے انھوں نے کہانی کو انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہانیاں تصویری صورت میں غاروں اور چٹانوں پر ثبت کی گئی ہیں۔ تہذیب و تمدن کے اس ارتقائی صورت میں بیان کی گئی یہ کہانیاں یقیناً سادگی کا مظہر ہوں گی۔ ان کے وسعتِ مطالعہ اور تاریخی ژرف بینی کا بین ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اس مضمون میں دنیا کی تقریباً تمام تہذیب یافتہ اقوام اور ملکوں میں رائج کہانی پن کی ارتقائی صورت کو بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ مضمون اس قدر جامع ہے کہ نہ صرف

ہندوستانی معاشرت بلکہ دوسری قوموں میں قصہ کہانی کی روایت کا احاطہ کرتا ہے۔ ہر زبان میں داستان کی روایت، ان کی خصوصیات اور عوام میں ان کی دل پذیری کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ داستانیں ہماری تہذیب کا جزو لاینفک ہے۔ زمانۂ قدیم سے کہانی پن میں سادگی کے ساتھ ساتھ اُس وقت کے سماجی مسائل، ان کی تشریح و توضیح اور حل کرنے کو جس طرح پیش کیا جاتا تھا وہ عوام دل چسپی کا باعث تھا۔

سید احتشام حسین بھی دوسرے محققین اور ناقدینِ ناول کی طرح صنفِ ناول کے جنم کو صنعتی دور کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ صنعتی انقلاب اور سائنس کی روز افزوں ترقی نے انسان کے رجحان کو فرضی دنیاؤں کے قصے کہانیوں سے حقیقی دنیا کے واقعات اور مسائل کی طرف موڑ دیا۔ کیوں کہ ناول میں زمان و مکان کی سچی تصویر کشی کی جاتی ہے اس لیے عام آدمی کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہا۔ اس بارے میں ان کی رائے ملاحظہ کیجیے:

> ''ناول اور مختصر افسانے دونوں صنعتی تمدن کے اثرات کا نتیجہ ہے اور جب سے صنعتی تمدن کی ابتدا ہوئی ہے یا سائنس اور حکمت کی ترقی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس وقت سے ناولوں اور مختصر افسانوں میں زمان و مکان کی حقیقت اور صداقت کو عروج حاصل ہوتا ہے۔ داخلیت اور خارجیت کی آمیزش، زمان و مکان کا کم یا زیادہ احساس، انسانی فطرت کے مختلف عناصر کی تشریح، مقصد کی وضاحت کہانی سے زیادہ کہیں نہیں پائی جاسکتی۔''(۵)

مضمون کے آخر میں انھوں نے داستانوی ادب اور جدید فنِ قصہ گوئی یعنی ناول اور افسانے میں حقیقی زندگی کی جھلک کو موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جدید قصہ گوئی میں شعوری طور پر زندگی کے حقائق کو بیان کیا جاتا ہے جب کہ قدیم طرزِ قصہ گوئی غیر شعوری طور پر یہ کام کرتی اور اس وقت کے لوگوں کی دل چسپی کا سامان مہیا کرتی تھی۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آج شعوری طور پر ناولوں اور افسانوں میں افسونِ حیات بیدار کیا جاتا ہے لیکن پہلے غیر شعوری طور پر زندگی اپنا جادو کہانیوں پر چلاتی تھی اور انھیں انسانوں کا عزیز ترین سرمایہ اور ان کی بہترین متاع بناتی تھی۔''(۶)

سید احتشام حسین کا یہی گہرا تجزیاتی انداز ان کی تنقید نگاری کی اصل پہچان ہے۔ وہ اپنی بات کو زیادہ پُر اثر اور مستند انداز سے پیش کرنے میں تاریخی شواہد سے کام لیتے ہیں۔ یہ مضمون مختصر ہونے کے باوجود جامعیت سے مملو ہے۔ اس بارے میں ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> ''احتشام حسین کو چوں کہ تاریخ، تہذیب اور اقدار سے خاصی دل چسپی ہے۔ اس لیے وہ ادب کی تفہیم کے لیے بالعموم تاریخی سیاق و سباق کو اہمیت دیتے ہیں۔''(۷)

سید احتشام حسین کا دوسرا مضمون ''اردو ناول اور سماجی شعور'' ہے جو ان کے مضامین کے مجموعے ''ذوقِ ادب اور شعور'' میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے اس مختصر مضمون میں اردو ناول، اس کے امتیازات اور اس کے سماجی ارتقا پر بڑی جامعیت سے بحث کی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ان منشا صرف اردو ناول میں سماجی شعور کے ارتقا کا کھوج لگانا ہے۔ مضمون کو طوالت سے بچانے کے لیے انھوں نے تمام ناول نگاروں اور ان کے فن پاروں کا احاطہ نہیں کیا۔ مضمون کے آغاز میں انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کہانی اور داستان کی جڑیں دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی ابتدا سے پائی جاتی ہیں۔ اردو ناول کی ابتدا کے بارے میں

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ناول کی اصطلاح بر صغیر میں انگریز حکومت کے استحکام سے وابستہ ہے۔ ان کے خیال میں ناول اور مختصر افسانہ جو داستانی طرزِ قصہ گوئی کی ارتقائی صورتیں ہیں۔ یہی اصناف ہیں جن میں انسانی سماج اور انسانی شعور میں تغیر و تبدل اور ارتقا کا احساس ہوتا ہے۔ صاحبِ مضمون کی رائے ملاحظہ کیجیے:

> ''آج ناول کی اصطلاح جس مفہوم میں مستعمل ہے بعد زمانی میں اسے جدید ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس لفظ کے ماتحت جو کچھ بھی ملتا ہے اس کی تاریخ ہندوستان کے اس دورِ بیداری سے شروع ہوتی ہے جو انگریزی حکومت کے استحکام سے وابستہ ہے بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ یہ وہ عہد ہے جس میں جدید استحکام کی آخری اور زوال کی ابتدائی حدیں ملتی ہیں۔ ویسے تو روایت کے تسلسل کے لیے کہانی اور داستان کے ڈانڈے ہر ادب کی ادب کی طرح اردو میں بھی انسانی سماج میں اس کی ابتدا سے مل جاتے ہیں لیکن جب ہم کہانی اور داستان کو ان کے ارتقائی فارموں میں دیکھتے ہیں جنھیں ناول یا افسانہ کہا جاتا ہے تو ہمیں انسانی سماج اور انسانی شعور میں تغیر اور ارتقا کا احساس ہونے لگتا ہے۔''(۸)

سید احتشام حسین نے اردو ناولوں میں سماجی شعور اور حقائق کے تعلق پر جو بصیرت افروز تنقیدی آرا پیش کی ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ صنفِ ناول اپنی موجودہ صورت میں مغرب کی دین ہے۔ لہٰذا ناول کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ جدید دور کا انسان اس کے گوناگوں مسائل، سماج کے ساتھ ان کا تعلق اور پھر فرد اور سماج کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا ہی دراصل ناول کی ابتدا کا ذریعہ بنا، کیوں کہ قدیم قصہ گوئی کے برعکس ناول انسان اور سماج کی مشکل گتھیوں اور پیچیدہ مسائل کا بہترین مظہر ہے۔ اس بارے میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''ناول ایک صنف کی حیثیت سے عہدِ سرمایہ داری کی پیداوار ہے، جب فرد اور سماج کی کش مکش بڑھی، جب جاگیر داری دور کی قدروں کے متعلق شک کا اظہار کیا جانے لگا اور جب سائنس نے عقائد اور روایات کی پرکھ پر آمادہ کیا، اس وقت انسان اور اس کے مسائل کو بہت سے پہلوؤں سے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی، گویا ناول ایک پیچیدہ سماج کا مظہر ہے۔''(۹)

اصنافِ ادب میں ناول کی وقعت پذیری اور دل پسندی سے کسی کو مجالِ انکار نہیں، کیوں کہ ناول کا فارم ایسا ہے جس میں ہر طرح کے مضامین با آسانی کھپائے جاسکتے ہیں۔ ناول کی اسی موضوعاتی ہمہ گیریت کی ایک وجہ اس میں عصری سماجی مسائل کی نشان دہی ہے جو اسے دوسری اصناف سے ممتاز و ممیز کر دیتی ہے۔ بلکہ بعض ناقدین تو ناول کو تاریخ سے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں۔ عالمی ادب میں جن ناولوں کو انسانی زندگی اور سماج کی صحیح ترجمانی کا مظہر قرار دیا گیا ہے اور عالمی سطح پر اسے عظمت حاصل ہوئی ہے۔ ان ناولوں کی ادبی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ جیسے ڈکنز کا ڈیوڈ کاپر فیلڈ، ٹالسٹائی کا وار اینڈ پیس، بالزاک کا ڈیوائن کامیڈی وغیرہ۔

اردو ناول کے ارتقا میں انھوں نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ چوں کہ ناول ہمارے ہاں مغرب سے آیا ہے اسی لیے اردو ناول کے مقام و منصب، موضوعاتی اور اسلوبیاتی تفہیم کے لیے صنفِ ناول کے عام ارتقا کو بھی بروئے کار لانا ضروری ہے۔ کیوں کہ اردو ناول نے زیادہ اثر ان ہی ناولوں سے لیا ہے۔ اس بارے میں ان کی ناقدانہ آرا ملاحظہ کیجیے:

''اردو ناول کے مقام، موضوع اور اسالیب کو سمجھنے کے لیے ناول کے عام ارتقا کو نظر انداز کرنا غلط ہی نہیں گمراہ کن اور بے نتیجہ بھی ہو گا کیوں کہ ناول کے مطالعے کے سلسلے میں وہ معیار نہیں قائم کیے جاسکتے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان میں قصہ کہانیوں کی ماقبل تاریخ روایت کے باوجود ناول کی ابتدا مغربی اثرات ہی کی مرہون منت ہے۔''(۱۰)

محولہ بالا بیان سے جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ دوسری زبانوں میں ناول کی ارتقائی صورت میں بہت سے عوامل کار فرما ہیں۔ یورپی ناول میں وہاں کی سماجی، سیاسی، تاریخی محرکات کی نشان دہی کے ساتھ فرد کی نفسیاتی مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ یورپی ناول پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں انقلابِ فرانس، یورپ میں صنعتی انقلاب، نو آبادیاتی نظام، معاشی استحصال، دنیا کی دو عظیم جنگیں، انقلابِ روس، معاشی بحران اور اس کے نتیجے میں فرد کی مجبوری، بے بسی لاچارگی کا نقشہ ان ناولوں میں بڑے ہی دل کش انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اردو ناول میں سماجی شعور کو بنظرِ غائر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس ارتقا میں کچھ ایسے ناول سامنے آتے ہیں جو بالکل سطحی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان ناول نگاروں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ ناول کے فکر و فن سے بالکل نابلد نظر آتے ہیں۔ اردو ناول میں سماجی شعور اور تاریخ بصیرت کی پہلی اینٹ رکھنے والے نذیر احمد اور سرشار ہیں۔ ان ناول نگاروں نے پہلی مرتبہ سماجی مسائل کی دل فریب عکاسی کی ہے۔ ہمارے اردو ادب میں بہت سے ناقدین نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کرنے میں بہت لیت و لعل سے کام لیتے ہیں۔ سید احتشام حسین دوسرے ناقدین کے برعکس اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد ہی اردو کا پہلا اور اہم ناول نگار ہے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں نذیر احمد وہ پہلا ناول نگار ہے جن کے ناولوں میں اس وقت کے عصری اور سماجی حقیقت نگاری کے مرقعے ملتے ہیں۔ اس بارے میں ان کی رائے ملاحظہ کیجیے:

''بہت سے نقاد نذیر احمد کو ناول نگار نہیں مانتے لیکن یہ محض اصطلاح کا چکر ہے۔ میں ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھ کر انہیں اردو کا پہلا اور بہت اہم ناول نگار تسلیم کرتا ہوں ۔ مراۃ العروس، توبتہ النصوح، فسانۂ مبتلا۔ ایامیٰ اور ابن الوقت ہر ایک میں گہرے سماجی حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ ہر ایک میں انیسویں صدی کے وسطی دور کا کوئی اہم مسئلہ بنیادی مقام رکھتا ہے۔ ہر ایک میں چند کردار بعض مسائل کے نمائندے بن کر زندہ اور متحرک شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ہر ایک میں مثالیت کے باوجود حقیقت پسندی اپنی جگہ رکھتی ہے۔''(۱۱)

مذکورہ بالا اقتباس سے ایک طرف اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ نذیر احمد ہی وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں میں سماجی حقائق کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ یہ ناول انیسویں صدی کے درمیانی زمانے کے ہندوستانی سماج کے کئی اہم اور بنیادی مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اسی طرح ان ناولوں کے بعض کردار چند ایک سماجی مسائل کے نمائندے بن کر اردو ادب کے زندہ کرداروں میں شمار ہوتے ہیں۔ جیسے ابن الوقت، مراۃ العروس کی ماما عظمت، فسانۂ مبتلا کا مبتلا، ہریالی بیگم اور غیرت بیگم اسی ظاہر دار بیگ اور کلیم وغیرہ ایسے جیتے جاگتے اور متحرک کرداروں کی صورت قارئین کے سامنے آتے ہیں۔ اس اقتباس کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا یہ کہنا کہ نذیر احمد ناول نگار نہیں تھے مصلح اور تمثیل نگار تھے۔ ان کے ناول، ناول نگاری کے فن پر پورے نہیں اترتے۔ وہ انھیں ناول کہنا بھی گوارا نہیں کرتے بلکہ ان کو تمثیل کہتے ہیں ۔ احتشام حسین نہ صرف نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار مانتے ہیں بلکہ وہ اسے اردو کا بہت اہم ناول نگار بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کو خیال

ہے کہ نذیر احمد زمانی اعتبار سے تو ویسے بھی پہلے ناول نگار ہیں مگر وہ اس لحاظ سے بھی پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اردو ناولوں میں سماجی حقیقت نگاری کی بنیاد رکھی ۔۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی میں شکست خوردہ مسلمان سماجی شکست وریخت کو شکار ہوئے۔ سماجی اور خاندانی لحاظ سے جس انتشار کے ہوئے وہی نذیر احمد کے ناولوں میں بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا۔ نذیر احمد نے اصغری ،ظاہر دار بیگ ،مبتلا، ہریالی بیگم اورابنِ الوقت جیسے لافانی کردار تخلیق کیے جو تخیلاتی نہیں بلکہ اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ سماجی شعوران کرداروں میں رچ بس کر سماجی ابتری کو بدلنے کی بھرپور سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان ناولوں میں اس زمانے میں مسلمانوں میں سماجی کی اصلاح پسندی کی مختلف تحاریک کا ذکر اور ناول کے کرداروں کا ان تحاریک سے انسلاک دراصل نذیر احمد کے عہد کی سچی تصویر کشی ہے۔ اس کے ساتھ ان ناولوں میں زبان وبیان کے چٹخارے کے ساتھ اس زمانے کی دلی کی گلی کوچوں ،پیشہ وروں کی بولیاں اور عمارتوں کی نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ نذیر احمد وہ پہلے ناول نگار ہیں جو ادبی اور سماجی شعور رکھتے تھے۔ سماجی شعور کی یہ بحث ان کے ناولوں کے موضوعات سے لے کر کرداروں تک محیط ہے۔

سید احتشام حسین نے نذیر احمد کے سماجی شعور کے بعد سرشار کو فسانۂ آزاد کو موضوع سخن بنایا ہے۔ سرشار کا فسانۂ آزاد اردو ناول کے ارتقا میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ لکھنؤ کے زوال پذیر تہذیب کا ایسا دل فریب اور دل دوز مرقع ہے جس میں ہمیں اس زمانے کے لکھنوی سماج کے کج رویے اور معائب نظر آتے ہیں۔ سرشار کے بارے میں ناقدین کی اس رائے کو نظر انداز کرتے ہیں کہ سرشار صرف فن کار تھے۔ ان کے سامنے ناول لکھنے کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ سید احتشام حسین اس بات کو سرے سے فضول سمجھتا ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''بعض ناقدین کا خیال ہے کہ سرشار ایک خالص فن کار ہیں اور ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ مقصد ادب میں کسی طرح داخل ہوتا ہے اور دونوں میں کس طرح ایک رشتہ قائم رہتا ہے تاہم اتنا کہنا ضروری ہے کہ سرشار کے یہاں ظاہری غیر جانب داری اور بے تعلقی کے باوجود کبھی طنز کے پردے میں اور کبھی کھل کر زندگی کی ان قدروں پر اظہار خیال ملتا ہے جن میں بدلتی ہوئی دنیا نے تناقص اور تضاد کی کیفیتیں پیدا کر دی تھیں اور یہ سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ وہ کن قدروں کو محض رسمی اور بے سود سمجھتے تھے اور کن میں انھیں زندگی کی جھلک ملتی تھی۔''(۱۲)

احتشام حسین کے مطابق سرشار کے تمام ناول فنی لحاظ سے ناقص ہیں مگر زندگی کے حقائق کی ایسی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں جس میں ہمیں اس زمانے کے لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب کی چلتی پھرتی تصویر نظر آتی ہے۔ یہ سرشار کا شاہ کار ہے۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے کی لکھنؤ، وہاں کی درباری سازباز، عیش پرستی جیسی قباحتیں اس ناول کا موضوع ہے۔ سرشار نے اس زمانے کے لکھنؤ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بہت دل فریب ہے۔ اس کے علاوہ سرشار کے قلم اس ناول میں آزاد اور خوجی جیسے لافانی کردار بھی تخلیق کیے۔

سید احتشام حسین کے مضامین کا مجموعہ ''ادب اور سماج'' جو ان کے پہلے مضامین کی توسیع ہے۔ ان کو فسانۂ آزاد میں خوجی کے کردار میں بڑی کشش نظر آتی ہے۔ ان کے خیال میں پورے ناول کی کہانی کو یہ دو کردار آزاد اور خوجی اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہیں۔ ناول کا مرکز و محور تو میاں آزاد کا کردار ہے مگر پوری کہانی خوجی کے کردار کے بغیر بے معنی اور پھیکی نظر آتی ہے۔ احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون ''خوجی ایک مطالعہ'' میں خوجی کے کردار کی نمایاں کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کبھی کبھی تو خوجی پر غور کرتے ہوئے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسے صرف لکھنو کا انسان سمجھنا اس کی عظمت اور آفاقیت کی توہین ہے۔ وہ ہر ایسے عہد میں پیدا ہوتا ہے جب اس دور کی صداقت پر شک ہونے لگتا ہے۔ وہ شیکسپیئر کو مالسٹاف اور کنگ لیئر کے درباری ظریف کی شکل میں ملا تھا سرونٹیز نے اسے ڈان کوگزوٹ اور رسینکو پانزا کے لباس میں پایا تھا۔ سرشار نے اسے خوجی کے بھیس میں ڈھونڈ نکالا اور منشی سجاد حسین نے حاجی بغلول کہ کر پکارا۔ وہ ہر دفعہ عاقلوں کی دنیا پر تنقید کرنے کے لیے اٹھتا ہے اور اپنی احمقانہ باتوں سے بہت سی ایسی صداقتوں کی طرف اشارہ کر دیتا ہے سنجیدگی جس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ لکھنؤ اور سرشار خوجی ہی کو جنم دے سکتے تھے۔''(۱۳)

فسانۂ آزاد کے پلاٹ میں جو بے ترتیبی، بے ربطگی، واقعات میں تضادات، جملوں کی تکرار اور غیر حقیقی کردار ہی اس ناول میں خوجی کے کردار کی وجۂ تخلیق بنی کیوں کہ اگر سرشار ایک منظم خیال کو ایک مربوط پلاٹ میں پیش کرتے تو ہو سکتا ہے پھر خوجی میں وہ جاذبیت نہیں ہوتی جو آج اس کردار کا سب سے مثبت پہلو ہے۔ اس بارے میں ابو الکلام قاسمی رقم طراز ہیں:

''احتشام صاحب نے فکشن کے کرداروں کے مطالعے میں حقیقت نگاری کے سکہ بند ترقی پسند نقطۂ نظر سے بھی انحراف کیا ہے۔ انھوں نے خوجی کے کردار کو حقیقت نگاری سے کہیں زیادہ ہمہ گیری اور ادبی جامعیت کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فکشن کے کسی کردار کے لیے اپنے گروہ یا اندازِ نظر کی نمائندگی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں روایتوں کا تسلسل مقید ہو اور جس میں صدیوں کی صداقت کی ترجمانی کرنے کی اہلیت ہو۔''(۱۴)

نذیر احمد اور سرشار کے بعد انھوں نے اردو ناول کے ارتقا کی تیسری کڑی عبد الحلیم شرر کے فن پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ شرر اردو میں تاریخی ناول نگاری کا باوا آدم سمجھے جاتے ہیں۔ فنی لحاظ سے شرر کے ناول کمزور ہیں۔ احتشام حسین جیسے جید نقاد کی عمیق مطالعے اور ژرف بینی سے مخفی نہیں تھی۔ لیکن شرر کی ناول گاری کے تمام معائب کی طرف توجہ دلانے کے باوجود اس بات کو مانتے ہیں کہ شرر کے ناولوں کے اپنے زمانے میں کافی پسند کیا جاتا رہا۔ شرر کے اسلوب اور طرزِ بیان نے ان کے ناولوں کو عوامی سطح پر کافی مقبول بنا دیا تھا ۔ شرر کی ناول نگاری کے محاسن اور معائب پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شرر نے اپنے زیادہ تر ناول مسلمانوں کی قدیم تاریخ سے متعلق تصنیف کیے اگر چہ یہ بات مسلمانوں کو ان کے فوری مسائل کے سمجھنے یا حل کرنے میں مدد نہیں دیتی تھی لیکن ان کے جذبۂ افتخار اور برتری کو ضرور اکساتی تھی۔ گویا شرر اپنے طور پر ناولوں کے ذریعے وہی کام انجام دینا چاہتے تھے جو دوسرے اپنی تاریخی کتابوں، علمی مضامین اور مذہبی مباحث سے انجام دے رہے تھے۔ شرر کے ناولوں کی سطح کئی حیثیتوں سے نذیر احمد اور سرشار کے ناولوں کی سطح سے پست تھی لیکن کچھ تو ان کا انداز بیان اور کچھ موضوع دونوں نے انہیں ہر دل عزیز بنا دیا۔ انھوں نے جو چند اصلاحی ناول لکھے ہیں ان کے موضوعات وقت کے عام تقاضوں اور اصلاحی اندازِ نظر سے تعلق رکھتے ہیں۔''(۱۵)

شرر کے اصلاحی ناول فنی لحاظ سے خاصے کمزور ہیں۔ اگرچہ ان ناولوں میں اس وقت کی عصری مسائل اور سماجی حقائق کی بھرپور عکاسی ملتی ہے، مگر فنی لحاظ سے یہ ناول کافی پھسپھسے ہیں۔ کیوں کہ شرر ناول نگار کے ساتھ ساتھ مورخ بھی تھے۔ ان کا مقصد بھی ان کے تاریخی شعور سے ہم آہنگ تھا۔ اردو ناول کے تشکیلی دور میں جو مقام اور مرتبہ رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کو حاصل رہا وہ کسی اور ناول کو نصیب نہیں ہوا۔ رسوا نے امراؤ جان ادا کی شکل میں ایسا نگینہ تراشا ہے جسے ناقدینِ ادب دادو تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ناول اگرچہ ایک طوائف کی بپتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس ناول کا مرکز بھی لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرہ اور یہاں نے نوابین کا طرزِ عمل ہے۔ یہ ناول انسانی نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ اس زوال پذیر سماج کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ رسوا کا دوسرا ناول ''شریف زادہ'' جو امراؤ جان ادا کی وجہ سے زیادہ موضوعِ بحث نہیں رہا۔ احتشام حسین نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ رسوا کا ناول شریف زادہ سماجی حقائس کے حوالے سے کافی اہم ناول ہے۔ اس ناول میں انسان اور سماج کے باہم تعلق کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بقول ان کے کہ اس ناول کو وہ پذیرائی اور توجہ نہیں مل سکی جس کا یہ حق دار ہے۔ اس بارے میں ان کی ناقدانہ بصیرت ملاحظہ کیجیے:

> ''رسوا کے ناول شریف زادہ میں اس نئے انسان کے جدوجہد کی تصویر ہے جو نئے سماج میں اپنی جگہ بنانا چاہتا ہے اور اگرچہ اس اہم سوانحی تصنیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی ہے لیکن جس نے بھی اس کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ اس پیشتر اردو میں ایسے ناول کی مثال نہیں ملتی۔''۱۶

سید احتشام حسین ان تنقید نگاروں میں نہیں جو ایسے فن پاروں کی بغیر توجیہ کے مدح سرائی یا مصلحتاً تنقید کرے جن فن پاروں میں فن اور فکر ہر دو لحاظ سے خامیاں ہوں۔ اردو ناول میں سماجی شعور اور حقیقت نگاری کے ارتقا کے سفر میں ایسے بہت سے ناول نگار ہیں جن کے ناول فنی لحاظ سے کافی کمزور تھے، سیکڑوں طرح کی خامیاں ان میں موجود تھیں۔ ایسے ناولوں سے نہ تو فن کی خدمت ہو رہی تھی اور نہ ان کے موضوعات سے سماج کی کچھ بھلائی ہو رہی تھی۔ اسی دوران پریم چند کے اردو ناول کے میدان میں قدم رکھا۔ پریم چند اپنے ناولوں میں ہندوستانی سماج کی بھرپور عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات، نچلے طبقے کے مسائل اور سماجی حقیقت نگاری کو موضوعِ سخن بنایا۔ پریم چند کی اسی خوبی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جب کوئی پریم چند کے ناول پڑھتا ہے تو پرانے ناولوں کے مقابلے میں بالکل ہی مختلف فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ پڑھنے والا عام انسانوں کی زندگی کے اتنے پہلو زندہ اور متحرک دیکھ لیتا ہے کہ اسے عوامی طبقے کی مشین چلتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ شعور میں گہرائی اور وسعت پیدا کرنا انسان کو مختلف حالات میں سمجھنے اور دیکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہی ایک اچھے فن کار کا کام ہے اور پریم چند نے اسے بڑی خوبی سے انجام دیا ہے اور ناولوں کو چھوڑ کر اگر صرف گئودان کو دیکھیے تو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔''(۱۷)

اردو ناول کی ارتقائی صورتِ حال کو واضح کرنے کے بعد مضمون کے آخر میں انھوں نے ناول کے فن پر مختصر مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ناول اور سماج کے تعلق کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ناول سماج کے مسائل کو کرداروں کے ذریعے قارئین تک پہنچاتا ہے، وہاں سماج کے ظاہری اور باطنی مشکل مسائل کا ایک قابلِ قدر نمونہ بن جاتا ہے۔ ان کے خیال میں ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ناول نگاروں کا مطمحِ نظر ایسے موضوعات ہیں جو سماج کے داخل اور خارج سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان ناول نگاروں

کے فن پاروں میں وہ جان نہیں جو پریم چند جیسے سماجی شعور اور حقائق پر نظر رکھنے والے ناول نگار کے ہم پلہ ہوں۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ناول جہاں سماج کا علم افراد (انفرادی کرداروں) کے ذریعے ہم تک پہنچاتا ہے وہیں وہ سماج کے پیچیدہ داخلی اور خارجی عمل کا مظہر بن جاتا ہے۔ لیکن اسے محض کسی خاص سوسائٹی ی اعہد کی تاریخ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ اس میں سطح کے ساتھ ساتھ کہرائی کا ناپنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے جو ناول لکھ رہے ہیں وہ ان باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں حالاں کہ ابھی تک کسی کو اتنی کامیابی نہیں حاصل ہوئی ہے کہ اسے پریم چند کے برابر بھی بٹھا سکیں۔''(۱۸)

محولہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پریم چند ہی نے اردو فکشن میں سماجی حقیقت نگاری کی جو بنیاد رکھی کوئی دوسرا اس میدان میں اس کی ہم سری نہ کر سکا۔ سید احتشام حسین کے خیال میں ناول وہ صنفِ ادب ہے جس کا موضوع انسان ہے۔ ناول کی کئی اقسام ہیں۔ ہر قسم اپنی ہئیت اور اسلوب میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، مگر ہر ناول کا موضوع انسان اور اس کے مسائل ہی ہوتے ہیں۔ ایک کامیاب ناول نگار وہ ہوتا ہے جو سماجی حقائق کو کرداروں کے ذریعے، بے ترتیب واقعات کو منظم انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کی وجہ سے وہ سماجی ارتقا کے عمل اور دستور کو سمجھتا ہے۔ ایسے ناول نگار اپنے قارئین کی توجہ اپنے فن پارے کی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جو ناول نگار اس طریقے سے بے پرواہو کر ناول تخلیق کرتا ہے وہ کبھی بھی ذہین قاری کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

> ''اگرچہ موضوع کے اعتبار سے ناول کو مختلف قسموں میں بانٹ دیا گیا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اپنے آخری تجزیے میں اس کا موضوع انسان ہی رہتا ہے۔ ناول نگار کرداروں کے عمل میں اپنے عمل کو آزماتا ہے اور جو کچھ غیر منظم شکل میں دیکھتا ہے اسے منظم بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس پردے میں وہ سماجی ارتقا کے عمل اور قانون کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی ناول نگار اس سے بے نیازی برتتا ہے تو وہ ذہین پڑھنے والے کو متاثر نہیں کر سکتا۔''(۱۹)

مضمون کے آخر میں انھوں نے عالمی ادب کے افق پر جگمگانے والے کچھ ناول نگاروں کے نام لیے ہیں۔ جنھوں نے ناول کے فن کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ وہ اس بات کے متمنی نظر آتے ہیں کہ اردو ناول لکھنے والے مذکورہ ناول نگاروں کے فن پاروں کو پڑھیں اور اپنے موضوعات اور مواد کو ان ناول نگاروں کی طرح کام میں لے آئیں۔ بحیثیت فکشن کے نقاد کے سید احتشام حسین کے متعلق ابو الکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> ''احتشام حسین نے شعری ادب سے کہیں بہتر اور کارآمد طریقے پر فکشن پر تنقید کیا ہے۔ وہ جب نذیر احمد کے ناولوں کی تاریخی حیثیت کا تعین کرتے ہیں یا فسانۂ آزاد کے مشہور کردار خوجی کو ایک تہذیبی عنصر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فکشن میں کردار نگاری کی روایتی تصور سے بہت بلند ہو کر غور کرتے ہیں اور اس ضمن مین بعض فنی نکات کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔''(۲۰)

ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے اور مارکسی تنقید کے اصولوں کو بروئے کار لانے کے باوجود انھوں نے فرسودہ تنقیدی اصول اور نظریات کو کبھی بھی نہیں اپنایا۔ وہ اردو ادب میں سائنسی اصولوں پر تنقید کی بنیاد رکھنے والے نقاد ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے ترقی پسند رجحانات کے تحت نظریاتی تنقید کے اصولوں کو مرتب کرنے کی کوشش کی اور قدامت پسندی اور انتہا پسندی، ادب اور سماج اور جدلیاتی مادیت کے مباحث میں ترقی پسند تنقید اور ادب کو واضح بنیادوں پر پیش کر کے سائنٹفک تنقید کی بنیاد ڈالی۔ وہ ادب اور زندگی پر تاریخی تبدیلیوں اور سیاسی شکست و ریخت کے اثرات پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔''(۲۱)

ڈاکٹر شارب ردولوی کی محولہ بالا بیان کی تائید ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''سید احتشام حسین ان نقادوں میں سے تھے جو تنقید کو سائنس سمجھتے تھے اور ادب کا فلسفہ بھی۔ تخلیق کار اور تنقید نگار میں فرق یہی ہے کہ تخلیق کار غیر منطقی اور غیر سائنسی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ نئے حسن کی تخلیق کا سبب بھی ہو لیکن تنقید نگار ایک سائنس دان کی طرح زیرِ تبصرہ ادب پارہ کو اس کے اپنے عہد اور قدما کے ادب اور پھر ایک روایت کے ادب کے بجائے مختلف النوع ادبی دھاروں کے تناظر میں دیکھتا ہے اور ایک دور کی حسیت کو دوسرے دور کے لیے ناموزوں قرار دیتا ہے اور وہ اس عمل میں متعلقہ علوم کی مدد سے ہم عصری جمالیات کا ایک ایسا میزان تیار کرتا ہے جو اپنی اعلیٰ شکل میں سائنس کے ساتھ ساتھ تخلیق کار درجہ پا سکتا ہے۔ جب کہ تخلیق کے لیے اس عمل سے گزرنے کے لیے منطقی ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔''(۲۲)

درج بالا اقتباسات اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ احتشام حسین نے ادب کا سماجی اور تاریخی پس منظر میں مطالعہ کیا۔ اسی مطالعے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے تنقیدی نظریات کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا۔ اسی وجہ سے مذکورہ بالا ناقدین نے انھیں اردو میں سائنٹفک تنقید کا بنیاد گزار قرار دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نورالحسن نقوی، فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۲

۲۔ ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۱۱

۳۔ احتشام حسین، سید، روایت اور بغاوت، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۸

۴۔ ایضاً، ص ۱۱۸-۱۱۹

۵۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۶۔ ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص ۱۱۹

۷۔ احتشام حسین، سید، روایت سے بغاوت، ص ۱۳۸

۸۔ احتشام حسین، سید، ذوقِ ادب اور شعور مشمولہ "مجموعہ سید احتشام حسین (جلد اول)"، مرتبہ: احمد سلیم، سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور، ۲۰۱۵، ص ۴۹۴

۹۔ ایضاً، ص ۴۹۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۹۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۹۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۹۷

۱۳۔ احتشام حسین، سید، ادب اور سماج، مشمولہ "مجموعہ سید احتشام حسین (جلد اول)"، مرتبہ: احمد سلیم، سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور، ۲۰۱۵، ص ۲۰۷

۱۴۔ ابو الکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص ۱۲۰

۱۵۔ مجموعہ سید احتشام حسین (جلد اول)، ادب اور سماجی شعور، ص ۴۹۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۹۹

۱۷۔ ایضا!، ص ۵۰۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۰۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۰۱۔۵۰۲

۲۰۔ ابو الکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص ۱۲۱

۲۱۔ مجموعہ سید احتشام حسین (جلد اول)، ص ۷

۲۲۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقید کا دائرہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸۱

References in Roman Script:

1. Noor ul Hassan Naqvi, Fan e Tanqeed aur Urdu Tanqeed Nigari, Educational Book House, Ali Garh, 2016, P:152

2. Abul Kalam Qasmi, Muasir Tanqeedi Rawwaye,Aks Publications,Lahore,P111

3. Ehtesham Hussain, Rewayat sy Baghawat,Idara Farogh Urdu,Laknow,1972.P118

4. Abid, P:118-119

5. Abid, P:137

6. Abul Kalam Qasmi,Muasir Tanqeedi Rawwaye,P:119

7. Ehtesham Hussain, Rewayat sy Baghawat,P:137

8. Ehtesham Hussain, Syed, Adab aur Shaor,Mashmoola,Majmooa Syed Ehtesham Hussain,(Vol1), Murattaba: Ahmad Saleem,Sang e Meel Publications, Lahore, 2015,P494

9. Abid, P:494

10. Abid, P:495

11. Abid, P:495

12. Abid, P:497

13. Ehtesham Hussain, Syed, Adab aur Samaj,Mashmoola,Majmooa Syed Ehtesham Hussain,(Vol1), Murattaba: Ahmad Saleem,Sang e Meel Publications, Lahore, 2015,P:207

14. Abul Kalam qasmi, Muasir Tanqeedi Rawwaye, P:120

15. Majmooa Syed Ehtesham Hussain(Vol 1), Adab aur Shaor, P:498

16. Abid, P:499

17. Abid, P:501

18. Abid, P:501

19. Abid, P:501-502

20. Abul kalam Qasmi, Muasir Tanqeedi Rawwaye, P:121

21. Majmooa Syed Ehtesham Hussain(Vol 1), P:7

22. Ashraf Kamal, Dr, Tanqeed ka Dayera, Misaal Publishers, Faisal Adab, 2016, P:181